بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

# اشارات

دین انسان کی فطرت کے کسی تقاضے کا جواب اور اس کی زندگی کی کسی حقیقی ضرورت کی تکمیل ہے، یا یہ ایک غیر ضروری بوجھ ہے جسے انسان کسی غلط فہمی کے زیر اثر کندھوں پر لادے چلا آ رہا ہے؟ اگر یہ ایک غیر ضروری بوجھ ہے تو یہ اس قابل ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اسے اتار پھینکا جائے۔ اگر یہ کسی حقیقی تقاضے کا جواب اور کسی واقعی ضرورت کی تکمیل ہے پھر اسے اس کے تقاضے اور اس کی ضرورت کی وسعت و اہمیت کے مطابق انسانی زندگی میں مناسب مقام حاصل ہونا چاہیے!

وہ ضرورت کیا ہے؟ وہ تقاضا کونسا ہے؟

یہ سوال دل میں لیے جب ہم اپنے گرد و پیش کی دور دور تک پھیلی ہوئی دنیا پر پہلی ہی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ سارا عالم نور و ظلمت اور یہ تمام جہانِ رنگ و بو بہترین نظم سے آراستہ اور بہترین آئین سے مالا مال ہے۔ یہ بے آئینی اور بدنظمی اور بے ترتیبی اور اندھیر گردی کی تماشا گاہ نہیں۔ مادے کی تمام کی تمام گوناگوں اشکال کشش و ثقل، سکون و حرکت، حرارت و برودت، قوت اور انرجی، لامعیت و اشعاعیت، نشو و نما، تغیر و حدوث اور عمل و ردعمل کے اٹل قوانین کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ قطرے اور سمندر، ذرات اور سورج، درخت اور پہاڑ، چیونٹیاں اور ہاتھی سب کے سب کوئی جنبش کیے بغیر نظم و ضبط کا جُوا اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی نگری ہے جس کی کوئی تعمیر مقررہ نقشے سے گھٹی بڑھی ہوئی نہیں ہے، ہر چیز اپنے صحیح استعمال کے لیے وقف ہے، پروگرام کے اوقات قطعی طور پر معین ہیں، حرکت کے لیے راستے بنے بنائے ہیں اور موجودات

کی گاڑیاں ان سے بال برابر اِدھر اُدھر نہیں ہوتیں، ٹریفک کے قواعد مقرر ہیں اور کوئی حرکت کرنے والا ان قواعد کی خلاف ورزی نہیں کرتا، ہر کسی کے حدودِ عمل کو باہم دگر الگ کر دیا گیا ہے، قوتیں اور فرائض تقسیم کر دیئے گئے ہیں چنانچہ بڑے سے بڑے وجود اور چھوٹے سے چھوٹے اجسام یک جا رہتے ہیں مگر کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا، تیز سے تیز اور سست سے سست رفتار پر موجودات کی بھاری بھرکم گاڑیاں بیک دم اربوں کی تعداد میں ایک دوسرے کے متوازی اور ایک دوسرے کو کاٹنے والے راستوں پر دوڑ رہی ہیں، اور لاکھوں برس سے دوڑ رہی ہیں مگر بغیر کسی خلل کے یہ دوڑ جاری ہے۔ ٹھوس اجسام اور مائعات اور گیسوں کی دنیا میں ایک دوسرے میں بالکل گتھی ہوئی ہیں مگر گڑبڑ نہیں ہوتی۔ جمادات اور نباتات اور حیوانات کے مختلف الاحوال عالم ایک دوسرے پر چھائے ہوئے ہیں مگر صلح و سلامتی سے نبھاؤ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس بستی کی ساری رونق آئین کا کرشمہ ہے، اس بزم کی ساری بہا ہمی تنظم کا عطیہ ہے اور اس گھر کی ساری آبادی ہدایت کے دم قدم سے ہے! جس طاقت نے موجودات کو خلق کیا ہے، اس نے آئین اور نظم بھی مقرر کیا ہے، اُس نے اُن کو ہدایت بھی دی ہے! یہی ہدایت ہر وجود کا "دین" ہے! کائنات کی بقا ہدایت، اور اس کے خالق کی ہدایت پر منحصر ہے، موجودات کا نشوو ارتقا دین، اور ان کے خالق کے دین پہ دار و مدار رکھتا ہے یہاں جو چیز پیدا ہوتی ہے اپنی ہدایت اور اپنا دین ساتھ لے کے آتی ہے، یہاں مادّہ کی جو نئی شکل بھی ظہور پاتی ہے اپنے لیے ضابطہ اور آئین گلے میں آویزاں کیے ہوئے نمودار ہوتی ہے، یہاں جو قوت بھی اُبھرتی ہے اپنی پیشانی پر اپنا پروگرام لکھا کے لاتی ہے۔

---

جمادات کو دیکھیے تو ان کی ہدایت کا ذریعہ طبعی جبریت ہے، نباتات کا مطالعہ کیجیے تو فطرتِ نامیہ کو ان کی رہنمائی پر مامور پائیں گے، حیوانات کا جائزہ لیجیے تو جبلّت ان پر راہِ عمل واضح کرنے کے لیے سرگرم کار ملے گی! لیکن انسان کا معاملہ موجودات کے ان تینوں خانوادوں سے کچھ دور تک تو ہم آہنگ رہتا ہے، لیکن جہاں سے اس کی شعوری اور ارادی زندگی کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں سے بالکل نئی صورتِ حالات سامنے آجاتی ہے۔ انسانی زندگی کا ایک دائرہ ہے جہاں طبعی جبریت اپنا فرض ادا کرتی ہے، پھر

ایک دائرہ ہے جس میں فطرت نامیہ کام کرتی ہے، پھر ایک اور دائرہ ہے جس میں حیوانی جبلت کا پارٹ سامنے آتا ہے۔ لیکن ان دائروں سے آگے جب اخلاقی و اجتماعی میدانِ کار شروع ہو جاتا ہے تو یہ تینوں رہنما قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور ہر ایک معذرت کرتی ہے کہ اب اگر میں یک سرِ مو بھی آگے بڑھوں تو پَر جلتے ہیں!

سوال یہ ہے کہ کیا یہ شعوری، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کا دائرہ ایسا ہے کہ اس میں ہدایت اور دین کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

یہ لکیر ہے کہ جسے پھاندتے ہی انسان کو ارادہ و اختیار کی گراں بہا ذمہ داری سے نواز دیا جاتا ہے یعنی اب کوئی قوت کشاں کشاں زندگی کو کسی لگے بندھے راستے پر بطورِ جبریت نہیں لے جائے گی، دوسرے لفظوں میں اب بیک دم کئی راستے سامنے ہونگے اور ان میں سے راہِ حق اور صراطِ مستقیم کا انتخاب کرنا ہوگا، ہر قدم پر دوراہے اور چوراہے پیش آئیں گے اور اپنے ارادے سے کسی ایک پر سوچ سمجھ کر قدم بڑھانا ہوگا کہ کونسی راہ فلاح کی منزل کی طرف جانے والی ہے!

یہ ارادہ و اختیار انسان کو جس پوزیشن میں لا کے کھڑا کر دیتا ہے وہ بڑی پیچیدہ پوزیشن ہے۔ وہ بیک وقت اپنے آپ کو طبعی ماحول اور اپنی ضروریات کی کشمکش میں بھی مبتلا پاتا ہے، اپنی خواہشات اور جذبات اور اپنی عقل کے درمیان بھی ہر لحظہ ایک نئے تصادم سے دوچار ہوتا ہے، قریب کے فائدوں اور نقصانات اور دُور کے نتائجِ اعمال کے درمیان گھر کر بھی وہ بُری طرح اُلجھتا ہے، وہ اپنی ذات کی خود غرضانہ حس اور معاشرے کے اجتماعی تقاضوں کے درمیان بھی رسہ کشی پاتا ہے، وہ قدامت پسندی اور جدت پرستی کی اونچ نیچ سے بھی دوچار ہوتا ہے، وہ افراط و تفریط اور عمل اور ردِ عمل کے تند اثرات کی زد پر بھی آتا ہے۔ شعور و اختیار کی زندگی ان اُلجھنوں سے اِس طرح بھری ہوئی ہے کہ آدمی کو جیسے ایک گھنے جنگل میں کھڑا کر دیا گیا ہو جہاں اونچے اونچے درخت سائیں سائیں کر رہے ہوں، کانٹے دار جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں، سر سے اونچی گھاس چاروں طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے ہو، طرح طرح کی بیلیں جال پھیلائے ہوئے ہوں اور جہاں کہیں کوئی خلا دکھائی دے، یہی گمان ہو کہ بس راہِ نجات یہی ہوگی۔ اُلجھنوں کے اس جنگل میں اہوائے نفسانی درندوں

کی طرح ہر گلی پھرتی ہوں، جذبات کے ناگ پھنکار رہے ہوں اور شیطان وسادس کے غول کے غول دہاں اتار رہے ، زندگی کو اپنا شکار بنا لینے کے لیے پوری تدابیر لڑا رہا ہو۔

انسان کے پاس حواس خمسہ موجود سہی مگر وہ تو صرف گردوپیش کے عالمِ مادّی کے خواص سے آگاہ کرکے بس کر دیتے ہیں، عقل کا ایک ٹمٹماتا دیا بھی روشن سہی مگر وہ تو اسی تیل سے روشن ہے جو حسّی علم سے فراہم ہوتا ہے، قیاس آرائی کی صلاحیت کارفرما سہی مگر یہ صلاحیت ہزار گھوڑے دوڑانے کے بعد بھی منزلِ یقین و آگہی تک تو نہیں پہنچاتی، یہ بھی تو کبھی گمان کی ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتی ہے، کبھی دوسری کی طرف اور کبھی تیسری کی طرف!

یہ پوزیشن ہے جہاں سیکولر فلسفے انسان کو لا کے کھڑا کر دیتے ہیں کہ جا بیٹا چڑھ جا سولی پر رام بھلی کریگا۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ ساری کائنات اسی امر کی گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خلق کر دینے کے بعد مخلوق کو ہدایت دیئے بغیر الجھنوں کے جنگل میں لاوارث چھوڑ دیتا ہے کہ جاؤ مرو یا جیو، مجھے کوئی واسطہ نہیں! وہ کہ جس کو مٹی کے ایک حقیر ذرّے تک کی بقا کی فکر ہے، جو گھاس کی ایک بے قیمت سی پتی کے نشوونما کا اہتمام کرتا ہے، جو ایک مچھر اور مکھی کے امن کا سروسامان کرتا ہے، جو ایک بیل اور گدھے کے لیے لا اینڈ آرڈر مقرر کرتا ہے، کیا انسان جیسی اعلیٰ ترین مخلوق ہی اس کی نگاہ میں ایسی بے وقر ہو کے رہ گئی ہے کہ اس نے اسے بالکل عاق کر دیا ہو کہ جاؤ جہنم میں، تمہارے لیے میرے پاس کوئی رہنمائی نہیں، ضابطہ نہیں، ہدایت نہیں، دین نہیں!

اس بات کے ماننے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ سرے سے خدا کے ہونے کا انکار کر دیا جائے لیکن خدا کو مان کر اس کا یہ تصور باندھنا کہ وہ مخلوق تو پیدا کرتا چلا جاتا ہے، لیکن اس کو زندگی کی راہِ فلاح بتلانے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا، کسی معقول انسانی ذہن کو سجھتا نہیں! کوئی اور اس تصور کو پیش کرتا ہو تو کرے، اسلام ایسے خدا کا تصور نہیں دلاتا۔ دوسرے انسان اسے قبول کر سکتے ہوں تو کریں، کسی مسلمان کا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔

---

انسانی ارادہ و اختیار کا راستہ عمل کی بن پیچ در پیچ وادیوں سے ہو کر جاتا ہے وہ تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی رہنمائی کا کوئی سر و سامان ہو اور چونکہ اس کی زندگی شعوری زندگی ہے اس لیے اس کی رہنمائی بھی شعوری ہو۔ اس کو ہدایت دی جائے اور اس کی عقل کو خطاب کر کے دی جائے۔ اسے دین بہم پہنچایا جائے اور اس کے ارادہ و اختیار کی اپنی رضامندی حاصل کر کے پہنچایا جائے۔

وہ ایک ہدایت کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے طبعی ماحول اور اس کے تقاضہائے نفس کے درمیان کشمکش ہو تو وہ جان سکے کہ کہاں تک اسے آگے بڑھنا ہے اور کس صورت میں اسے پیچھے ہٹنا چاہیے۔ وہ ایک ضابطے کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی خواہشات اور اس کی عقل کے درمیان رسہ کشی ہو تو وہ دونوں کو کس متعین نقطے پر جمع کرے۔ وہ ایک قانون کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے سامنے مختلف آراء اور اقدامات اور لائحہ ہائے عمل قریبی نتائج اور دور کے نتائج کو پیش کر کے الجھن میں ڈالیں تو وہ کس کے مقابلے میں کس کا انتخاب کرے۔ وہ ایک دین کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی ذات کی خود غرضیاں اور اس کے معاشرتی ماحول کے تقاضے بیک وقت اس پر دباؤ ڈال رہے ہوں تو وہ اپنے آپ کو کس موقف پر جمائے؟ وہ ایک معیارِ فیصلہ کا ضرورت مند ہے کہ جب قدامت اور جدت، افراط و تفریط، عمل اور ردِ عمل کے مختلف مؤثرات اس کی زندگی کے سامنے اپنے اپنے مطالبے رکھ رہے ہوں تو کسے وہ قبول کرے اور کسے رد کرے! وہ ضرورت مند ہے ایسی متعین حدود کا کہ خیر و شر کے معرکوں میں اسے معلوم ہو سکے کہ کہاں تک بڑھتے چلے جانا ہے اور کہاں پہنچ کر رک جانا ہے۔ وہ ضرورت مند ہے ٹریفک کے ایسے قواعد کا اور ایسے نشانات و علاماتِ راہ کا کہ جن کی پابندی میں وہ شہرِ حیات کے اندر افکار و اعمال کی گاڑیاں حادثوں کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر چلا سکے۔

انسان چونکہ ارادہ و اختیار رکھتا ہے، اس لیے وہ کسی دین اور ہدایت اور ضابطے کو صرف اسی صورت میں مان سکتا ہے جبکہ اس کے پیچھے کوئی ایسی اتھارٹی ہو جسے اس کی عقل واجب الاطاعت سمجھے۔ پھر ارادہ و اختیار ہی کی وجہ سے چونکہ وہ دین، ہدایت اور ضابطے میں دخل دینے اور تحریف اور رد و بدل کر دینے پر بھی قادر ہے ـــــ اور اس کی خواہشات و جذبات کے تند ریلے ہر حد کو توڑ دینے کا موقع بھی

رکھتے ہیں، لہٰذا اس کی ضرورت ایک ایسا دین، ایک ایسی ہدایت اور ایک ایسا ضابطہ چاہتی ہے جس میں تقدس موجود ہو اور وہ ردّ و بدل کے ارادے سے اس کی طرف انگلی بھی اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ پھر اس کی فطرتِ "بیم و رجا" تقاضا کرتی ہے کہ اس کے لیے دین اور ضابطۂ ہدایت ایسا ہو کہ جس سے انحراف کرنا موجبِ سزا اور جس کی اطاعت کرنا ذریعۂ حصولِ جزا ہو۔ پھر چونکہ انسانی زندگی کو مختلف زمانوں، مختلف قسم کے ماحول اور مختلف حالات سے سابقہ پیش آتا ہے لہٰذا وہ ایسی رہنمائی کی ضرورت مند ہے جو ادلتے بدلتے حالات میں اسے یکساں کام دے سکے۔

یہاں تک ہم نے انسانی زندگی کے لیے دین کی جو ضرورت واضح کی ہے، ٹھیک اسی کا جواب ہے اسلام!

---

اسلام کے بالمقابل دوسرے کچھ مذہبی نظریے اور نظام بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا فکری تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرے سے اُس تقاضے اور اُس ضرورت کو پیش ہی نہیں کرتے جس کو پورا کرنے کے لیے انسان ایک دین چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ دین بہم پہنچانے کے بجائے محض ایک مذہب اور دھرم اور منت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُن میں کوئی ایسا ہے جو زندگی کو جبری عذاب قرار دے کر اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلانے والے وسیلے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، کوئی ایسا ہے جو روح کو سرور بخشنے کے لیے ایک مشروبِ مسکن، ایک نبیذِ خواب آور یا ایک بادۂ سرور بخش بن کر سامنے آتا ہے، کوئی ایسا ہے جو انسانی روح کے قطرے کو ذاتِ باری تعالیٰ کے سمندر سے جا ملانے کا پروگرام پیش کرتا ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ آدم کے گناہِ اول کے نتائج سے اولادِ آدم کو بچانے کی اسکیم سامنے رکھتا ہے۔ کسی نے انسان کی احتیاجِ ہدایت، اس کی تشنگیٔ دین اور اس کی طلبِ ضابطہ کا جواب بنا کر اپنے آپ کو متعارف نہیں کرایا اور نہ کاروانِ زندگی کی رہنمائی کی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی ہے!

ان مذہبی نظاموں نے ایک خدا، اور دو خداؤں، اور بے شمار خداؤں ـــــ اور ان کے علاوہ بے حد و حساب دیوتاؤں اور روحوں کا تصور انسان کو محض ایک روحانی تسکین کے لیے دیا ہے۔ انہوں نے اوہامی معتقدات کی بھول بھلیاں میں ڈال کر اسے حیرت زدہ اور مبہوت کرنے کی کوشش کی ہے۔

انہوں نے پوجا پاٹ، نفس کشی اور ترکِ دنیا کے ایسے اسالیب وضع کیے ہیں کہ آدمی ان کے اندر ڈگمگاتا ڈگمگتے ہوئے مگن رہے کہ وہ مایا کے جال، جیون کے عذاب اور گناہوں کے چکر سے نجات پانے کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے قلب کو جِلا دینے کے لیے کچھ محدود اخلاقی ضابطے بھی بنائے ہیں جس پر عمل پیرا ہونے سے میل اترتا ہے اور روح اس قابل ہو جاتی ہے کہ ذاتِ باری میں جذب ہو جائے۔

بس اس سے آگے نہ مذاہب نے انسانی زندگی کے بارے میں کوئی ذمہ داری قبول کی ہے، نہ کوئی کمانڈ اور ہدایت سیاست و تمدن کے معاملات میں فراہم کی ہے۔ آخر جو مذاہب دنیا کو ملعون اور ترکِ دنیا کو ذریعۂ نجات قرار دیتے ہیں، وہ خود اس "ملعون دنیا" کے لیے پروگرام اور منصوبہ اور ضابطہ کیسے دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے سیاست و تمدن سے انسان کو بائیکاٹ کرنے کی تعلیم دی ہے وہ کیسے سیاست و تمدن کے لیے نقشۂ کار دنیا کے سامنے لا سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے زندگی کی ہماہمیوں کو ایک عقوبت اور ایک سزا اور گناہ کا ایک چکر قرار دیا ہے وہ کس منہ سے اُن ہماہمیوں کے درمیان کھڑے ہو کر نوعِ انسانی کو روزمرہ مسائل میں رہنمائی دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے دنیوی امارت و بادشاہت کے متعلق یہ خبر دی ہو کہ اس میں دلچسپی لینے والے "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہیں ہو سکتے اُن سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خود ہی دنیوی امارت و بادشاہت کے نظم و انصرام کا کوئی درس دے سکیں گے۔

اِس طرح کے مذاہب نے صدیوں سے انسان کو عجیب اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ وہ اپنے معاملاتِ زندگی میں منہمک ہوتا ہے تو یہ اُسے ٹوکتے ہیں کہ خبردار! دنیا کے جنجال میں پڑ گئے تو خدا نہیں ملے گا۔ وہ خدا کی طرف ان کے بتائے ہوئے نقشے پر لپکتا ہے تو اس کا اپنا جسم کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی طبعی ضروریات اس کا منہ نوچتی ہیں، اس کے بال بچے بھوکوں مرتے ہیں، اس کا گھر اُجڑتا ہے، اس کا کاروبار تباہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دو قدم خدا کی طرف آگے چلتا ہے، پھر اپنے فطری تقاضوں کی کھینچا تانی کے زور سے اپنے دنیوی معاملات کی طرف چار قدم پیچھے پلٹتا ہے۔ پیچھے پلٹتا ہے تو احساسِ گناہ کا کانٹا ضمیر میں چبھتا ہے۔ وہ مذہب سے پوچھتا ہے کہ میرے لیے ان دنیوی معاملات میں کوئی رہنمائی ہے جو مجھے احساسِ گناہ سے نجات دلا سکے؟ اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اب یا تو وہ تمدن سے مستقل طور پر دہانی طلب

دُور کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہوگا وہ سلامتی سے ہٹا ہوا ہوگا۔ اسلام جس طرح یکسر آزاد معیشت کے خلاف ہے اسی طرح ذرائع پیداوار کو بھی قومی ملکیت بنا دینے کا مخالف ہے۔ آپ اگر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادیٔ ضمیر، عزتِ نفس، خود اعتمادی ایسی صفات اسی صورت میں پرورش پاتی ہیں جب انسان کو اس امر کا احساس ہو کہ وہ روٹی حاصل کرنے کے لیے غلامی اختیار کرنے پر مجبور نہیں، اور اگر وہ چاہے تو خدا کی وسیع و عریض کائنات میں اپنے وسائل رزق آزادی کے ساتھ ڈھونڈھ سکتا ہے۔ کیا آپ پوری دنیا کو ایک جیل خانہ بنانے میں ہی انسانیت کی فلاح دیکھتے ہیں؟ (ع-ح)

# بقیہ اشارات

بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ یا مذہب کا قلادہ گلے سے نکال کر دنیا کے میدان میں پوری چھوٹ پا لیتا ہے۔

ان مذاہب کا یہ خلاء کہ یہ انسان کو دنیا میں اجتماعی زندگی کے سارے فرائض انجام دیتے ہوئے خدا سے نہیں ملا سکتے اور سیاسی و تمدنی مسائل میں کوئی مکمل رہنمائی بہم نہیں پہنچاتے، یہی اس کا موجب ہوا کہ تاریخی مواقع پیدا ہو جانے پر "مذہبی طبقات" آگے بڑھیں، اس خلاء کو پُر کریں اور خدا اور مذہب کے نام پر اپنی مرضی کو مقدس ضابطہ بنا کر عوام الناس پر ٹھونس دیں۔ اس لحاظ سے تھیوکریسی کا ظہور ہمیشہ کسی مذہبی نظام کے اس نقص کا نتیجہ تھا کہ وہ دنیوی معاملات کے لیے رہنمائی نہیں دیتا تھا اور اس نظام کے زیر اثر آنے والے انسانوں کے لیے مذہب کی منظوری کے بغیر دنیوی معاملات چلانا طمانیتِ ضمیر سے محرومی کا موجب تھا۔ چنانچہ مذہبی طبقوں اور عام لوگوں میں یہ سودا ہوا کہ ہم تم کو دنیوی معاملات میں مذہب کی منظوری بہم پہنچائیں گے تم ہمارا اقتدار مانو۔ اس سودے نے مذہب (جیسا کچھ بھی رہا ہو) کا الگ ستیاناس کر دیا اور نظامِ تمدن کا الگ حلیہ بگاڑ دیا! یہ تلخ تجربہ اس انجام کو پہنچا کہ مذہبی طبقوں کے تسلط کے خلاف عام آدمی کو جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ خون خرابوں کے بعد اس سمجھوتے پر ختم ہوئی کہ دنیا کے معاملات میں مذہب کا کوئی دخل

نہ ہوگا، اور مذہب کے امور میں اہلِ دنیا مداخلت نہیں کریں گے، دونوں کا دائرہ کار ایک خطِ تقسیم کھینچ کر الگ کر دیا گیا ہے۔ اسٹیٹ اور کلیسا نے زندگی کی جاگیر تقسیم کر لی۔ اجتماعی زندگی اسٹیٹ نے اپنے قبضے میں لے لی اور انفرادی اور نجی زندگی کلیسا کے حوالے کی گئی۔ یوں دین اور سیاست الگ الگ ہوئے۔

اس ساری تاریخ فساد کی اصل جڑ کیا ہے؟ ــــ مذاہب کا حقیقی انسانی ضرورت کا مکمل جواب نہ ہونا اور زندگی کی رہنمائی کی صلاحیت نہ رکھنا!

---

اسلام ــــ ان تمام مذاہب کے بالمقابل (خواہ وہ اسلام کی اصل ہیئت کو بگاڑ کر ایک نئی وضع پر لائے گئے ہوں، یا وہ خود انسانی ایجاد و اختراع کا نتیجہ ہوں) اپنے آپ کو ایک جداگانہ حیثیت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی ہر ایک بنیادی ضرورت کا جواب بن کے ابھرا ہے، وہ تمام کے تمام دنیوی معاملات میں رہنمائی کی پوزیشن اختیار کر کے اپنی دعوت پیش کرتا ہے۔ وہ حالات و ضروریات اور نظریات و احساسات کے خبگل میں انسانی ارادہ و اختیار کے سامنے صحیح راستہ نکال دینے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اس کی بغل میں خدا کا دیا ہوا ــــ نہ کہ کسی طبقے کا گھڑا ہوا ــــ ایک مستقل اور مقدس ضابطہ ہے۔

اسلام کا خدا نہ تو پتھر کا ایک بُت ہے، نہ کھیل تماشے رچانے والا شعبدہ گر ہے، نہ مخلوق کو عذاب میں ڈال کر لطف لینے والا کوئی عشرت پسند مہاراجہ ہے، اور نہ وہ ایک غیر ذمہ دار خالق ہے۔ وہ اپنی خلق کا خالق و رازق بھی ہے، اُن کا منتظم اور منصرم بھی ہے، اُن کا ہادی اور قانون ساز بھی ہے اور اُن کا فرماں روا اور حاکم بھی ہے ــــ واحد اور لاشریک فرماں روا اور حاکم! چنانچہ اسلام اپنے دروازے سے داخل ہونے کی شرطِ اوّل یہی قرار دیتا ہے کہ خدا کو اس کی ساری صفات کے ساتھ اپنی زندگی کا الٰہ مانو، اُسے حکم و اختیار کے لحاظ سے سب سے برتر مانو، اسے واجب الاطاعت ہونے کے لحاظ سے درجۂ اوّل پر رکھو، اس کے آگے پوری طرح گردن ڈال دو! تقاضا کیا جاتا ہے کہ اپنا سب کچھ لا کے اسی ایک اللہ کے حوالہ کر دو، اپنی قوتیں، اپنے اعضاء، اپنے اموال، اپنے اوقات! مطالبہ ہے کہ پوری کی پوری زندگی کا سودا چکا لو، اور اس طرح چکا لو کہ پھر دوسرے تاجروں اور دوسرے گاہکوں سے کوئی معاملہ کرنے کی

گنجائش باقی نہ رہے! اصرار ہے کہ زندگی میں تصرف کرنے کا حق خدائے واحد کے لیے اس حد تک خاص کر دو کہ اس کے مقابلے میں کسی غیر کا تو کیا، خود تمہارا اپنا بھی کوئی حق باقی نہ رہے! یہ صد تکرار چاہا گیا ہے کہ ایک بار ادھر رُخ کر لو تو پھر ہر طرف سے مُنہ موڑ لو، ہر جانب سے آنکھیں پھیر لو، ایک ہی بارگاہ کی طرف یکسُو ہو جاؤ!

پھر رسولؐ کو سامنے لایا جاتا ہے تو اس حیثیت سے سامنے لایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا بھیجا ہوا نمائندۂ خاص ہے، یہی ہے جس کے ہاتھ سے ضابطہ ملے گا، جس کی زبان الٰہی ہدایت کی ترجمانی کریگی۔ جو خدا کی مرضیات کی عملی تفسیر پیش کرے گا، جو مستقل اسوۂ حسنہ ہوگا۔ اس کی بے چون و چرا اطاعت کرنی ہوگی، اس سے معاملات میں رہنمائی لینی ہوگی، اِس سے اختلافات و نزاعات میں آخری فیصلہ لینا ہوگا، اس سے امورِ حیات میں سند پکڑنی ہوگی، جو کچھ بیٹھے کر دے کوئی دوسرا اس کی تنسیخ نہیں کر سکتا جسے یہ منسوخ کر دے اُسے کوئی دوسرا جائز نہیں ٹھہرا سکتا جسے یہ حرام کر دے وہی حرام ہوگا، جسے یہ حلال کر دے وہی حلال ہوگا۔ اس کا دامن تھام کے چلو گے تو اللہ کے دین پر کاربند ہو سکو گے۔

اسلام کا یہ ہے خدا، اور ایسا ہے اس کا رسولؐ کہ جن کی اتھارٹی اور سند سے جو ضوابط، جو اصولِ کار، جو قوانین اور جو احکام ملتے ہیں وہ ایک مسلمان کو مسلمان ہونے اور رہنے کے لیے پورے کے پورے قبول کرنے پڑتے ہیں۔ عقائد، عبادات، اخلاقی احکام اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانین و ضوابط سب کے سب مل کر ایک دین بنتے ہیں، جسے ردّ کرنے والے پورا ردّ کرتے ہیں اور قبول کرنے والے پورا قبول کرتے ہیں۔ یہاں کا تصورِ توحید اگر وحدت الٰہ کا عقیدہ دیتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ وحدتِ آدم اور وحدتِ حیات کا شعور بھی دیتا ہے۔ یہاں زندگی کی جاگیر کو خدا اور قیصر، کلیسا اور اسٹیٹ، مذہب اور سیاست کے درمیان بانٹنے کے لیے کوئی لکیر نہ کھنچی ہوئی ملے گی، نہ کھینچنے کی گنجائش!

یہاں تقسیمِ حیات کے معنی صریحاً شرک کے ہیں۔ یہاں زندگی کے کسی شعبے کو خدا کے حکم و اختیار سے نکال کر کسی دوسرے کے حوالے کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس شعبے میں خدائے واحد

کے بالمقابل ایک دوسرا خدا مان لیا گیا۔ یہاں کسی معاملے کو خدا کے رسولؐ کی تعلیم کی زد سے باہر رہے جانے کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں لیا جا سکتا کہ رسولؐ کے مقابل کی ایک دوسری اتھارٹی مان لی گئی۔ یہاں کسی چیز کو کتاب الٰہی کے دائرۂ بحث سے خارج قرار دینا صرف ایک ہی نتیجہ دیتا ہے کہ کتاب الٰہی کے مقابلے میں کوئی دوسرا معیارِ فیصلہ برتر قرار دے دیا گیا۔ اسٹیٹ اگر اسلامی نظریے سے ہٹ کر کسی اور نظریے پر قائم ہوتا ہے اور وہ خدا و رسولؐ کے دین کو اپنی حدود سے دھکیل کر مساجد میں جا محبوس کرتا ہے تو اس اسٹیٹ کی نوعیت ایک طاغوت کی سی ہے۔

---

جس نظام میں دینِ برحق کا وہ جزوِ اعظم جو اجتماعیات سے متعلق ہے، معطل کر دیا جائے اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اس کے صرف اس جزء پر اکتفا کریں جو ذاتی اور نجی امور سے واسطہ رکھتا ہے تو اس سے دنیا کا خطرناک ترین تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تضاد ایک سوال یہ پیدا کرتا ہے کہ دین کا وہ جزو جو معطل کیا جا رہا ہے کیا خدا و رسول کا دین نہ سمجھا جائے گا اور وہ بھی دین ہے تو کیا وہ موجبِ خیر و برکت اور واجب الاطاعت نہیں، بلکہ اس کی صرف تلاوت و قرأت کافی ہے؟ دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر زندگی میں بہ یک وقت دو اقتدار، دو نظریے اور دو الگ الگ ضابطے برسرِ عمل لائے جائیں۔ تو چاہے ان کے لیے کتنی ہی باریکی سے میدانِ کار تقسیم کیا گیا ہو دونوں کے تقاضوں میں تصادم ہوئے بغیر نہیں رہتا، ایسی صورت میں کونسی طاقت فیصلہ کن اور بالاتر قرار پائے گی؟ ظاہر بات ہے کہ اسٹیٹ "انا دلا غیری" کے دعویٰ کے ساتھ کام کرتا ہے تو فوج، پولیس، قانون، عدالت، خزانے، ریڈیو، نظامِ تعلیم کی ساری مؤثر طاقتوں کو جلو میں لیے جب یہ کوئی اقدام کرے گا تو "مذہب" کی مجال نہیں ہو سکتی کہ دم مار سکے۔ یوں جب فیصلہ کن طاقت اسلام کے مقابلے میں غیر اسلام ہو تو اسے تسلیم کر کے کوئی مسلمان کیسے مسلمان رہیگا! اس کے لیے تو ابتداء "نؤمن ببعض الکتاب و نکفر ببعض الکتاب" سے ہو گی اور انتہاء "نؤمن بغیر الکتاب و نکفر بکل من الکتاب" پر! پھر ایک عام سوال یہ نمودار ہو گا کہ خدا و رسول کا جو دین اجتماعی زندگی کے وسیع اور پیچ در پیچ معاملات میں ذریعۂ ہدایت اور حلِ مشکلات کی حیثیت میں کام

دینے والا نہیں رہا اُس کی اور ضرورت کیا ہے؟ کیا دوسرے انفرادی مذاہب کی طرح محض ضمیر کو سُن اور روح کو مست کرنے کے لیے کلمہ کا ورد اور نماز روزہ کی عادت اور ذکر و تسبیح کے وظیفہ کو استعمال کرکے یہ امت اطمینان حاصل کرسکتی ہے کہ دین داری کا حق ادا ہوگیا؟ یہ اس لیے ممکن نہیں کہ یہاں کلمہ اور نماز روزہ اور ذکر میں سے جس جزء کو بھی لیجیے، خود ہر ایک کے اندر ایک اجتماعی نظام کا تصور پوری طرح جذب ہے۔ اور اسلام کے عقیدے اور اس کی عبادات خود بخود دین و سیاست کی وحدت کی طرف لے جاتی ہیں۔

پھر اس مصیبت کا کیا حل کہ جب آپ زندگی اور دین کو اس طرح پھاڑ دیتے ہیں کہ مذہب الگ ایک دائرے میں سکڑ جائے اور سیاست مذہب کی مداخلت سے بے نیاز ہوکر میدانِ حیات میں جو لانیاں دکھائے تو اس سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹتا ہے اور دونوں کے دونوں فساد زدہ ہو جاتے ہیں۔ جو طبقہ سیاست میں کارفرما بنتا ہے وہ بناؤ اور بگاڑ کے وسیع اختیارات تو پا لیتا ہے لیکن اس کے ذہن و سیرت کو کنٹرول کرنے والی کوئی طاقت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے ظلم اور خیانت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ دوسری طرف جب دین کے پیکر کو ہاتھ پاؤں اور پر پُرزے کاٹ کر آپ نے ایک لوتھ کی لوتھ بنا کے ڈال دیا تو بے بسی کے سارے نتائج مذہبی طبقے کو پیش آئے رہیں گے۔ اس طبقے میں تفرقہ آئے گا، اس میں انتشار پیدا ہوگا، اس میں ظرف کی محدودیت نمودار ہوگی، اس میں حوصلوں کی پستی آئے گی، یہ مذہب کو کاروباریت کے رنگ میں رنگے گا، یہ درباداری اور قصیدہ خوانی اور کسی نہ کسی کی دامن برداری کے فتنوں میں مبتلا ہوگا۔ نہ خیر اُدھر رہے گی، نہ فلاح اِدھر ہوگی۔ اُدھر بھی فساد ہوگا، اِدھر بھی بگاڑ ہوگا۔ دونوں کا فساد اور بگاڑ خود معاشرے کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی ایسے نظام کے تحت امن چین سے نہیں جی سکتے جو زندگی کو تقسیم کرکے دو طاقتوں اور دو نظریوں اور دو طبقوں کو وجود دیتا ہو۔

سوچنے کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اجتماعی زندگی ہمیشہ ایک اساسی نظریے کی محتاج ہوتی ہے، اور آج جبکہ نظریات کی کشمکش کا دور ہے کسی بھی قوم کے لیے نظریہ و نصب العین کی طاقت کو ساتھ لیے بغیر معرکہ ہائے حیات سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں رہا، توڑ پھوڑ کے اس خاص دور سے سلامتی کے ساتھ وہی ریاستیں اور وہی معاشرے گذر سکیں گے جو نظریات و مقاصد کے بل پر زندہ ہیں۔ اسلام ہمیں سیاست و تمدن کے لیے ایک بلند ترین نظریہ و نصب العین دیتا ہے جسے اگر مرکزی روح قرار دیا جائے تو ہماری ساری سرگرمیاں اس کے ذریعے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اس سے ہمیں ایک اجتماعی طرزِ فکر اور ایک نقطۂ نظر ملتا ہے، وہ ہمیں ایک معیارِ فیصلہ فراہم کرتا ہے، وہ ترقی کے راستے پر ہماری رہنمائی کرتا ہے

اور وہ قدم آگے بڑھانے کے لیے ایک زوردار محرک داعیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاست کے دائرے سے اسلام کو نکال باہر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نظریہ و نصب العین کا ایک خوفناک خلا پیدا ہو جائے۔ یہ خلا جب اپنے پُر کیے جانے کا شدت سے تقاضا کریگا تو یا تو آپ کو سرمایہ داروں کی دنیا سے نظریۂ وطن پرستی و قوم پرستی کو مستعار لینا پڑیگا، یا پھر اشتراکی نظریے کے لیے زندگی کے دروازے کھولنے ہونگے۔ وطن پرستی اور قوم پرستی سے اب دنیا آگے نکل آئی ہے، خود پاکستان میں ابتک اسکی کھپت کے کوئی آثار نہیں ہیں اور نہ آئندہ کے لیے کوئی توقع کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ خلا اگر برقرار رہے گا تو یہ کمیونزم کے لیے ایک مستقل دعوت ہوگا۔ عقل مندی یہ ہے کہ اسلامی نظریہ اختیار کرکے یہ خلا باقی نہ رہنے دیا جائے۔

---

جی ہاں! قطع نظر آپ کی اس غلط بیانی سے، کہ دین گذشتہ تیرہ سو سال میں سیاست سے بے دخل رہا ہے یہ بجا ہے کہ آج کسی ملک میں اسلامی نظام برسرِ عمل نہیں ہے۔ مگر اور بھی بہت سی مطلوب چیزیں ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی ہیں۔ اُن میں ایکا نہیں رہا، ان میں ایک اصولی ہیئت اور ایک مقصدی تحریک ہونے کا شعور مر گیا ہے، اُن سے انسانیت کی رہنمائی کا منصب چھن چکا ہے، اُن کی تحقیق و ایجاد کی صلاحیتیں ٹھٹھر چکی ہیں، ان میں دوسروں سے مسابقت کا داعیہ برسرِ عمل نہیں رہا، ان میں کردار کی بلندی باقی نہیں، ان کی اخلاقی قدروں کی جڑیں سوکھ رہی ہیں، ان میں معاشی بدحالی پھیل چکی ہے، ان میں دوسروں کی غلامی نے بہت سی خرابیاں پیدا کردی ہیں۔ جس طرح ان سارے پہلوؤں میں سے کسی پہلو میں بھی اصلاح و تعمیر کی کوششیں اس دلیل سے لغو اور باطل نہیں ٹھہرائی جاسکتیں کہ چونکہ مدت سے یہی حال چلا آرہا ہے لہٰذا اب اسے کیوں بدلا جائے، یا چونکہ کوئی مسلمان ملک بھی آج کسی مطلوبہ نعمت سے مالا مال نہیں ہے لہٰذا پاکستان ہی کیوں اس سے بہرہ مند ہو، اسی طرح اسلام کو بہ حیثیت ایک دین کے پوری کی پوری زندگی پر کارفرما بنانے کی کوشش کا بطلان اس دلیل سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی منطق اگر انسانی دنیا میں مقبول ہوگئی ہوتی تو نہ جمہوری انقلابات واقع ہوتے، نہ اشتراکی اور فسطائی نظام قائم ہوسکتے، نہ ہی پہلے سے چلی آنے والی کسی غلط اور نامطلوب صورتِ حالات کو بدلنے کا ارادہ کسی دل میں راسخ ہوسکتا۔

آخر مذہب و سیاست کو اسلامی نظریہ کے تحت ایک کرنے کی جس مثال کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں پہلے قائم کرنی ہی پڑیگی۔ خود ہی اسے روکنا اور پھر خود ہی کہنا کہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے لہٰذا اسے شجرِ ممنوعہ قرار دینا چاہیے، معقولیت کی ایک اونچی مثال ہے!!

---